بنگلور میں ایک اہم سیمینار اور اس نواح کا میرا پہلا سفر

سعید احمد اکبر آبادی

گذشتہ ماہ ستمبر میں جنوبی ہند کے مشہور حسین و جمیل شہر بنگلور میں ایک عظیم الشان سیمینار منعقد ہوا جو ۱۴ سے شروع ہو کر ۲۰ ستمبر تک جاری رہا۔ اس کا موضوع بحث و گفتگو تھا انڈیا کی یونیورسٹیوں میں مذہب کا مطالعہ اور اس کا اہتمام و انتظام بنگلور کے مندرجۂ ذیل چار اداروں نے کیا تھا:

1- Centre for advance study of religion and society.

2- The myth society.

3- National Institute of social sciences.

4- Indian Institute of world culture.

ڈاکٹر کے۔ باگو جو ایک مقامی مشن کالج میں مریکن پروفیسر ہیں وہ اس سیمینار کے جنرل سکریٹری مقرر کئے گئے۔ جولائی میں راقم الحروف کو اس سیمینار میں شرکت اور ایک مقالہ پڑھنے کا جب دعوت نامہ ملا تو موضوع بحث کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر اسے فوراً منظور کر لیا۔ علی گڈھ سے پروفیسر خلیق احمد نظامی اور خاکسار بس صرف ہم دو مدعو تھے۔ چنانچہ علی گڈھ سے تو ہم دونوں ساتھ گئے ہی۔ دہلی سے دتی

© rasailojaraid.com

یونیورسٹی کے وائس چانسلر شری کرپال سنگھ۔ پروفیسر ہربنس سنگھ اور ڈاکٹر مشیر الحق ہمراہ ہو گئے۔ ۴ ستمبر کو دن کے سوا نو بجے پالم سے ہمارا ہوائی جہاز اڑا اور درمیان میں ایک گھنٹہ کے لئے حیدرآباد میں ٹھہرتا ہوا ½۱۲ بجے کے لگ بھگ بنگلور پہنچ گیا۔ ڈاکٹر جون بی۔ کارمن (John. B. Carman.) جو دراصل ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں مگر ایک برس سے زیادہ سے مدراس میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے مقیم ہیں اور اس سیمینار کے بڑی حد تک کرتا دھرتا بھی تھے۔ ہوائی اڈہ پر موجود تھے۔ چونکہ پانچ بجے بنگلور یونیورسٹی میں عصرانہ تھا اس لئے کارمن صاحب ہم سب کو کاروں میں لے کر سیدھے یونیورسٹی پہنچے۔ عصرانہ بڑا پر تکلف تھا اور یہاں سیمینار کے ممبروں کے علاوہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، کالجوں کے پرنسپل اور چند پروفیسر موجود تھے۔ ایک گھنٹہ تک اکل و شرب کے مشغلہ کے ساتھ تعارف کے بعد باہم ملاقات اور گفتگو ہوتی رہی۔ چھ بجتے ہی ہم سب ایک ہال میں جمع ہو گئے اور اب سیمینار کی افتتاحی تقریب شروع ہوئی۔ سیمینار کے صدر شری ایم پی۔ ایل شاستری ایم۔ اے۔ ایم ال سی جو سنسکرت ودیا پیٹھ کے ڈائرکٹر ہیں قرار پائے تھے اس لئے پہلے انھوں نے تعارفی اور استقبالیہ تقریر کی اور اس کے بعد بنگلور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی۔ کے۔ گوکک نے "ہماری یونیورسٹیوں میں مذہب کی اسٹڈی" پر ایک فاضلانہ خطبہ پڑھا اور رسمی طور پر سیمینار کا افتتاح کیا۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں یہ کارروائی ختم ہو گئی تو ہم لوگ بنگلور کے مشہور انگریزی ہوٹل شلش پہنچا دئے گئے جہاں ہر ایک کے لئے ایک الگ کمرہ پہلے سے رزرو کرا لیا گیا تھا۔ ہمارے جو رفقا سبزی خور تھے ان کے قیام کا انتظام اسی طرح کے ایک دوسرے ہوٹل میں تھا۔

دوسرے دن سے باقاعدہ سیمینار شروع ہو گیا جو ہمارے ہوٹل ہی کے ایک بڑے ہال میں منعقد ہوتا تھا۔ نشست صبح شام دونوں وقت ہوتی تھی۔ نو سے ایک اور پھر تین سے پانچ تک۔ سیمینار میں جن حضرات نے شرکت کی اور اس کی کارروائی میں عملی حصہ لیا ان کی تعداد چالیس تھی جن میں سات یا آٹھ مقامی تھے اور باقی حضرات ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسر یا بعض اداروں کے ڈائرکٹر تھے۔ البتہ پروفیسر ولفریڈ اسمتھ محض اس میں شرکت کے لئے ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ سے آئے تھے۔ چنانچہ جس دن سیمینار ختم ہوا اسی روز وہ براہ دہلی واپس ہو گئے۔ ۵ ستمبر کو صبح نو بجے سیمینار شروع ہوا تو پہلا مقالہ مطبوعہ پروگرام کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطابق مرکزی وزارت تعلیم کے مشیر جے۔ پی۔ نائک کا " یونیورسٹی میں مذہب کی تعلیم سے متعلق ایجوکیشن کمیشن کے خیالات" کے موضوع پر تھا۔ لیکن وہ کسی وجہ سے نہیں آسکے لہٰذا وقت کے وقت معذرت بھیج دی بہرحال پانچ تاریخ سے آٹھ تک چار دنوں میں جو مقالات پڑھے گئے اور جن پر بحث ہوئی ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) ڈاکٹر جے۔ ایل۔ مہتا پروفیسر فلسفہ بنارس ہندو یونیورسٹی: مذہب کی یونیورسٹی اسٹڈیز میں بین الثقافتی مفاہمت کے مسائل

(۲) مختلف مضامین کے تحت مذہب کا قابل ذکر درس و مطالعہ:-

(الف) فلسفہ کے ماتحت:- ڈاکٹر کے۔ ایس۔ مورتی پروفیسر فلسفہ آندھرا یونیورسٹی والٹیر

(ب) ہندوستانی تاریخ میں:- پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔

(ج) سنسکرت اور انڈولوجی:- شری ایم۔ بی۔ ایل شاستری صدر سیمینار

(د) علم الانسان میں:- ڈاکٹر اے۔ ایبن پروفیسر و صدر شعبۂ علم الانسان آندھرا یونیورسٹی

(۳) ہندوستانی یونیورسٹیوں میں مذہب کی تعلیم کے مسائل:- ڈاکٹر ٹی۔ ایم۔ پی مہادیون مدراس یونیورسٹی۔

(۴) مختلف المذاہب سوسائٹی میں مذہب کی تعلیم:- ڈاکٹر حسن عسکری عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

(۵) مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے: ڈاکٹر نہار رنجن رے شملہ انسٹیٹیوٹ"

(۶) مذہب کی تعلیم کے لئے یونیورسٹیوں کے نئے پروگرام:-

(الف) عثمانیہ یونیورسٹی کا شعبۂ تقابلی مذہب و ثقافت:- ڈاکٹر محمد یوسف الدین عثمانیہ یونیورسٹی

(ب) وسوا بھارتی میں مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا پروگرام:- ڈاکٹر ایس۔ سی۔ سین گپتا۔ پروفیسر فلسفہ وسوا بھارتی۔

(ج) پنجابی یونیورسٹی میں گرو گوبند سنگھ اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا تحقیقی پروگرام:- سردار کرپال سنگھ وائس چانسلر پنجابی یونیورسٹی۔ پٹیالہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۷) ہندوستان میں مختلف مذاہب کا درس و مطالعہ موجودہ زمانہ میں :-

(الف) جین مذہب :- ڈاکٹر ڈی - ملوانیا ڈائرکٹر ال - ڈی انسٹیٹیوٹ آف انڈولوجی احمد آباد

(ب) بودھ مذہب :- ڈاکٹر آر سی پانڈے - پروفیسر بودھیات دہلی یونیورسٹی

(ج) ہندو پاک میں اسلامیات کا درس و تحقیق :- سعید احمد اکبر آبادی

(د) ہندو مذہب کا مطالعہ اور ریسرچ :- ڈاکٹر کے - شیورامن بنارس ہندو یونیورسٹی -

(ھ) سکھ مذہب کا مطالعہ اور ریسرچ :- پروفیسر ہربنس سنگھ پنجابی یونیورسٹی -

(و) مسیحی مذہب :- ڈاکٹر کاج باگو

(ز) غیر ہندوستانی مذاہب میں ہندوستانی اسٹڈیز : پروفیسر بھاریہ ڈائرکٹر ریسرچ ڈپارٹمنٹ گاندھی پیس فاؤنڈیشن - نئی دہلی -

(ح) مولانا آزاد کا نقطۂ نظر مذاہب عالم کے متعلق : ڈاکٹر مشیر الحق پٹیالہ پنجابی یونیورسٹی -

(ط) ہندو عقیدہ اور زندگی کے متعلق مسیحیوں کا مطالعہ :- ڈاکٹر جون - بی - جیسی تم - بنگلور

(۸) دنیا کے موجودہ حالات کے پیش نظر یونیورسٹیوں میں مذاہب کی تعلیم :- پروفیسر ولفریڈ اسمتھ - ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ ،

یہ سب مقالات نہایت پُر مغز - مدلل اور پُراز معلومات تھے - ان سے مختلف مذاہب کے مطالعہ و تحقیق اور ان میں جدید رجحانات کے متعلق جو معلومات چار دن میں حاصل ہو گئیں اگر کوئی اس کو ہی موضوع بنا کر ایک برس مطالعہ کرتا تب بھی اتنی معلومات حاصل نہیں ہو سکتی تھیں اور اس طرح کے سیمینار کا یہی سب سے بڑا فائدہ ہے اور اسی وجہ سے امریکہ اور یورپ وغیرہ میں یہ بہت مقبول اور رائج ہے - ہر مقالہ کے بعد اُس پر بحث و گفتگو اور سوال و جواب ہوتا تھا اور اُس سے موضوع مقالہ کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر روشنی پڑتی تھی میں نے اپنے مقالہ میں صرف اُن کوششوں کا جائزہ لیا تھا جو تقسیم کے بعد سے اب تک انڈو پاک میں اسلامیات کی تعلیم اور ان پر ریسرچ کے سلسلہ میں ہوئی ہیں - لیکن سیمینار میں بیٹھ کر میں نے محسوس کیا کہ یہ مقالہ تشنہ ہے کیونکہ میں نے اس میں جدید رجحانات کا ذکر اور اُن پر تبصرہ نہیں کیا تھا - اس بنا پر جب میری باری آئی تو جناب صدر کی اجازت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نے ایک زبانی تقریر کی۔ مقالہ سائیکلو اسٹائل کیا ہوا ہر ایک کے پاس موجود تھا ہی اس لئے میں نے چار پانچ منٹ میں پہلے مقالہ کا خلاصہ بیان کیا اور اس کے بعد رجحانات پر تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ رجحانات تین قسم کے ہیں:

(۱) قدامت پرستی (ORTHODOXY)

(۲) ترقی پسندی (PROGRESSIVENESS.)

(۳) آزاد فکری (LIBERALISM)

اول الذکر کی خصوصیت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا خواہ کوئی مسئلہ و معاملہ ہو بہرحال اُس کا حل کسی ایک فقہی مسلک کی روشنی میں ہی تلاش کیا جائے اور سرِ مو اس سے انحراف روا نہ رکھا جائے۔ اس کے بالمقابل ترقی پسندی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصل قانون قرآن و حدیث میں ہے اور فقہی مسالک کی حیثیت اس قانون کی تشریح و توضیح کی ہے وہ بجائے خود قانون نہیں ہیں، اس بنا پر کسی جدید مسئلہ کا حل اولاً براہِ راست قرآن و حدیث میں دیکھنا چاہیئے اور اس کے بعد فقہ سے وہی کام لینا چاہیئے جو عدالت میں بحث کرتے وقت ایک وکیل نظائر سے لیتا ہے۔ اب رہا تیسرا رجحان: اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف قرآن کو ماخذ تسلیم کرتا ہے حدیث کو حجت نہیں مانتا۔ پھر اپنے لئے قرآن کی آزاد اور بے قید و بند تفسیر و توضیح کا حق بھی مانتا ہے۔ میں نے کہا کہ میرا تعلق دوسرے طبقہ سے ہے اور یہی رجحان میرے نزدیک صحیح ہے۔

سیمینار میں مقالات پر جو بحث و گفتگو ہوئی اُس سے یہ بات تو صاف طور پر واضح تھی کہ مذاہب کے مطالعہ کی اہمیت اور ضرورت سب تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ بحث و گفتگو زیادہ تر اس پر رہی کہ

(۱) ایجوکیشن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں "مذہبی تعلیم (Religious education)" اور "مذہب کی تعلیم (Education of Religion)" میں فرق کیا ہے اور اگرچہ اول الذکر کو سیکولرزم کے خلاف بتایا ہے۔ لیکن موخر الذکر کی اہمیت اور ضرورت کو مانا ہے اور اس کو سیکولرزم کے خلاف قرار نہیں دیا۔

(۲) کمیشن کی اس رپورٹ کی روشنی میں کیا سیکولر یونیورسٹیوں میں "مذہبی تعلیم" کا انتظام کرنا بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مناسب ہوگا ؟

(۲) فلسفہ، تاریخ ، سنسکرت اور عربی وغیرہ جیسے مضامین کے ماتحت مذہب کی جو تعلیم ہوتی ہے وہ کافی ہے یا اس کے لئے یونیورسٹیوں میں مستقل کوئی انتظام ہونا چاہیئے ؟

یوں تو ہر مقالہ پر بحث کے دوران میں بہت سی باتیں زیر گفتگو آئیں جس میں میں نے بھی حصہ لیا لیکن لوٹ لوٹ کر اصل بحث انھیں تین مذکورۂ بالا نقاط پر آجاتی تھی ۔ اس سلسلہ میں بعض اصحاب کی رائے یہ تھی ۔۔ اور شملہ والے ڈاکٹر نہار رنجن رے سب سے پیش پیش تھے کہ مذہبی اور روحانی تعلیم کا شعبہ الگ نہیں ہونا چاہیئے ۔ لیکن اکثریت اس کے خلاف تھی ۔ بہر حال مذاہب کی تعلیم (Comparative Religions.) اور اُس کے لئے حسب استطاعت و موقع مستقل شعبوں کے قیام کی ضرورت پر سب کا اتفاق تھا ، چنانچہ ۸ ستمبر کی نشست میں جو صرف صبح کا ہی تھی پروفیسر اسمتھ کے مقالہ کے بعد سیمینار کی طرف سے ایک متفقہ بیان اسی مضمون کا اشاعت کے لئے منظور کیا گیا ۔ اور اس کے بعد جانبین کی طرف سے اظہار شکریہ کی رسمی کارروائی کے بعد ۱۱ بجے سیمینار ختم ہوگیا ۔

میرا پبلک لکچر | سیمینار کے علاوہ اس کے بانیوں نے ڈاکٹر مہادیون بنارس یونیورسٹی ۔ ڈاکٹر حسن عسکری عثمانیہ یونیورسٹی اور خاکسار راقم الحروف ہم تین اشخاص کے ایک ایک پبلک لکچر کا بھی انتظام کیا تھا اور اس کی منظوری پہلے ہی لے لی تھی ۔ میرے لکچر کا موضوع تھا "The concept of Din in the Quran" (قرآن میں دین کا تصور) یہ لکچر ۷ ستمبر کو شام کے چھ بجے یونائیٹڈ تھیالوجیکل کالج کے عظیم الشان اور وسیع ہال میں ڈاکٹر کے ۔ ڈی مسری دیون کی صدارت میں شروع ہوا اور ۷ بجکر دس منٹ پر ختم ہوا ۔ ہال امریکن ، یوروپین اور ہندوستانی مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا ۔ ہمارے سیمینار کے شرکاء ہندو اور مسلمان بھی تھے لیکن غالب اکثریت عیسائیوں کی تھی ۔ سیمینار کی طرح لکچر کی زبان بھی انگریزی تھی اور بجائے مقالہ کے زبانی تقریر ۔ اس لکچر میں میں نے لکچر کی دعوت پر رسمی شکریہ ادا کرنے کے بعد حسب ذیل امور پر گفتگو کی :۔

(۱) دین کے لفظ کی اصل :۔ میں نے بتایا کہ یہ لفظ خالص عربی ہے اور اُن مستشرقین کی لسانیاتی اصول کی روشنی میں مدلل تردید کی جو کہتے ہیں کہ دین دراصل پہلوی یا سیرین زبان کا لفظ ہے اور زردشت نے اسے استعمال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ پروفیسر اسمتھ میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان مستشرقین میں میں نے ان کا نام بھی لیا۔

(۲) دین کے معنی اور تعریف : بعض مستشرقین اور ان کے تتبع میں ڈاکٹر جواد علی نے تاریخ العرب
ل الاسلام میں لکھا ہے کہ دین بمعنی مذہب کی تعریف ناممکن ہے کیوں کہ مذہب (Religion)
میں اتنی اور اس قدر متنوع ہیں کہ اُن میں کسی چیز کو مابہ الاشتراک قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ میں نے اس کا ذکر
لے کہا کہ یہ رائے صحیح ہو یا غلط۔ بہر حال قرآن میں دین کا تصور بہت واضح اور صاف ہے۔

(۳) دین کا قرآن میں تصور :۔ وہ یہ ہے کہ دین اسلام ہے۔ یعنی اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینا۔
ا کو ایک ماننا اور اُس کی اطاعت کرنا۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ یہ دین حضرت آدم کے زمانہ سے محمد رسول اللہ
، اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی رہا ہے۔ یہ دین خدا کا دین ہے کسی خاص پیغمبر یا نبی کا نہیں۔ اسی وجہ سے قرآن
۔ نہ دین کی جمع ادیان کہیں آئی ہے اور نہ اس کو کسی پیغمبر کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ مثلاً دینِ موسیٰ، دینِ
سیٰ یا دینِ محمد وغیرہ۔[1]

(۴) شریعت :۔ لیکن دین ایک کلی طبعی ہے جس کا وجود صرف ذہن میں ہوتا ہے اور خارج میں
ں کا تحقق افراد کی شکل میں ہوتا ہے۔ اسی طرح دین کا وجود خارجی شریعت کی شکل وصورت میں ہوتا ہے،
ں دونوں میں رابطہ ایسا قوی ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح جسم و روح میں
مال باقی نہ رہے تو زندگی باقی نہیں رہتی۔

(۵) شرائع اور مناہج کا اختلاف :۔ لیکن چونکہ شریعت میں احوال زمان و مکان اور قوموں کے طبائع
کا لحاظ ہوتا ہے۔ جو بدلتے سدلتے رہتے ہیں اس بنا پر شریعت میں اختلاف کا ہونا ناگزیر ہے۔

(۶) حاصل :۔ اب قرآن کہتا ہے کہ جب دین ایک ہے اور وہی ایک روح ہے جو وقتاً فوقتاً حسب
ورت وموقع شریعت کے مختلف پیکروں میں ظاہر ہوتی رہی ہے تو پھر تم لوگ دین کو کسی ایک شریعت کے
میں محدود و مقید کر کے اللہ کے دین میں کیوں تفریق پیدا کرتے ہو۔ تم اگر واقعی اللہ کے اطاعت گزار ہو یعنی مسلم

---

[1] اسی بنا پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شاہ ولی اللہ الدہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں وحدۃ الادیان
لفظ کیوں استعمال کئے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو تو تمھارا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ دین کا ظہور جس شریعت کے پیکر میں بھی ہو تم اُس کو بے چون وچرا مانتے اور اُس پر عمل کیے چلے جاؤ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر سابق پیغمبر لاحق کی آمد کی اطلاع اور اپنے ماننے والوں کو اس کی اطاعت کا حکم دیتا رہا ہے ۔

قرآن مجید سے ان تمام نقاط بحث کو مدلل و مبرہن کرنے کے بعد میں نے شریعت محمدی کی بنیادی خصوصیات عالمگیری ۔ انسانی وحدت و مساوات اور عدل اجتماعی پر گفتگو کی اور آخر میں میں نے کہا :۔ خواتین و حضرات میں جانتا ہوں کہ میرے اس لکچر کو سن کر آپ میرا مذہب قبول نہیں کریں گے لیکن جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اُس سے کم از کم آپ حضرات کو یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ قرآن کا تصور دین کس درجہ واضح ۔ مکمل اور سائنٹفک ہے اور دوسرے پیغمبروں اور اُن کی لائی ہوئی کتابوں کے متعلق ہمارے دلوں میں کس قسم کا جذبۂ عقیدت و ارادت پیدا کرتا ہے ۔ لکچر کے ختم ہونے پر جناب صدر کے تحسینی کلمات اور کالج کے پرنسپل کے رسمی شکریہ کے بعد جب میٹنگ برخاست ہوئی اور میں ہال سے باہر آرہا تھا تو محترم بشپ آگے بڑھے ۔ مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا اور فرمایا " میں آپ کی تقریر سن کر خوش ہوا ہوں " دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر یوسف الدین (عثمانیہ یونیورسٹی) سے ملاقات ہوئی تو لکچر کی بڑی داد دی اور فرمایا " ہال میں ایک عیسائی میرے پاس بیٹھے تھے وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ اکبرآبادی جو کچھ کہہ رہے ہیں کیا سب مسلمان بھی اسے مانتے ہیں " ڈاکٹر صاحب نے کہا " میں نے جواب دیا " آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں ؟ آپ تو صرف یہ دیکھئے کہ اکبرآبادی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ قرآن سے ہے یا نہیں ، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ من وعن قرآن کے مطابق اور اس پر مبنی ہے " عثمانیہ یونیورسٹی سے سیمینار میں شرکت کے لئے ایک اور نوجوان ڈاکٹر محمد مرتضیٰ صدیقی آئے تھے ۔ انھوں نے تفاتاً کوئی مقالہ تو نہیں پڑھا البتہ بحث و مذاکرہ میں سرگرم حصہ لیا تھا ۔ بہرحال بڑے لائق و فاضل ہیں ۔ اسلامیات پر امریکہ اور یورپ میں لکچر دے چکے ہیں اور ساتھ ہی نماز روزہ کے پابند بڑے دیندار اور جوشیلے مسلمان ہیں دوسرے دن ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بے حد تعریف کی اور بولے " حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے تصور دین کو اس سے زیادہ جامعیت اور بلاغت کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا ۔ رات تو آپ نے کمال ہی کر دیا ۔ یوں تو داد اور بھی مسلم اور غیر مسلم حضرات نے دی ۔ لیکن میں نے " عثمانی برادرز " کا ذکر صرف اس غرض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کہا ہے کہ یہ دونوں حضرات اسلامیات کے فاضل اور ڈاکٹر ہیں اور ساتھ ہی نہایت راسخ العقیدہ اور سچے مسلمان ۔ دوسرے دن مقامی انگریزی روزنامہ دکن ہیرالڈ نے اس لکچر کا خلاصہ ایک کالم میں شائع کیا۔

بنگلور میں مزید قیام | ۸ ستمبر کو بارہ بجے دوپہر سیمینار ختم ہوا اور احباب اور رفقاء واپس ہونے لگے۔ لیکن چونکہ میرا ادھر کا پہلا سفر تھا اس لئے میں نے میسور اور مدراس دیکھنے کی غرض سے مزید پانچ روز کا اور پروگرام بنالیا تھا اور اسی کے مطابق ڈاکٹر بارگوسنے ہوائی جہاز میں ریزرویشن کرادیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ سیمینار ایک خاص حلقہ میں شہر سے الگ تھلگ ہوا ہے اس لئے کسی مسلمان کو میرے آنے کی کیا اطلاع ہوگی میں تن تنہا ریل یا بس کے ذریعہ میسور جاؤں گا اور انشاءاللہ سیدھا اسے دیکھ کر بنگلور واپس آ مدراس چل دوں گا۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ۷ ستمبر والے میرے پبلک لکچر کا دعوت نامہ کالجوں میں تقسیم ہوا تو اس سے ان کالجوں کے مسلم اساتذہ کو اور ان کی وجہ سے شہر کے حضرات کو میری آمد کی اطلاع ہوگئی۔ چنانچہ ۹ ستمبر کی شام کو میں ہوٹل کے ڈائننگ ہال سے ڈنر کھا کر نکل رہا تھا کہ دیکھا پانچ اصحاب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ علیک سلیک اور تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ امیر الوفد بنگلور کی جماعت اسلامی کے امیر مولانا سید جلال احمد امین آبادی تھے اور ان کے رفقاء یہ حضرات تھے :

(۱) جناب یوسف شریف صاحب کنٹریکٹر

(۲) مسٹر خالد عرفان ایم۔ ایس سی۔ ایک مقامی مشن کالج میں کیمسٹری کے لکچرر ہیں لیکن اردو زبان کے شاعر اور ادیب و نقاد بھی ہیں انگریزی اور اردو دونوں میں لکھتے ہیں اور معیاری رسالوں میں ان کے مضامین چھپتے ہیں۔

(۳) جناب مشتاق احمد صاحب بی۔ ایس سی۔ بی۔ ایل اکاؤنٹ اسسٹنٹ۔

(۴) جناب نذیر احمد صاحب بی۔ ایس سی ایک سرکاری ادارہ میں آفس سپرنٹنڈنٹ۔

انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک کلچر کے زیر انتظام میری تقریر | مزاج پرسی اور ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد ان حضرات نے کہا کہ انھوں نے انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک کلچر کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے اور وہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ماتحت مسلمانوں کے ایک عام اجتماع میں میری تقریر کرانا چاہتے ہیں۔ میں نے پس و پیش اور اپنی عدیم الفرصتی عذر کیا۔ یوسف شریف صاحب نے کہا کہ آپ ۹ ر کی صبح کو میسور جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اگر تنہا ریل سے یا بس سے گئے تو تکلیف ہوگی اور تنہا دیکھیں گے بھی کیا۔ اس لئے میں آپ کے لئے کار کا انتظام کر دوں گا ۹ ر کی صبح کو آپ کار سے میسور چلئے اور ۱۰ ر اور ۹ ر کی درمیانی شب میں ہمارے ہاں تقریر کیجئے۔ یوسف صاحب نے یہ موقت پیشکش ایسی کی کہ میں رضامند ہو گیا۔ چنانچہ دوسرے دن ہی یعنی ۷ ر ستمبر کو بڑے بڑے پوسٹروں کے ذریعہ جلسہ کا اعلان کر دیا گیا اور خود ان حضرات کی تجویز اور خواہش کے مطابق تقریر کا عنوان "ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل" مقرر ہوا۔ اس کے بعد ۸ ر ستمبر کو جب دن کے بارہ بجے سیمینار اور وہاں کی جماعتی خم ختم ہو گئے تو حسب قرارداد مولانا جلال احمد کو مستثنیٰ کر کے باقی چاروں اصحاب تین بجے کے قریب شیلٹن ہوٹل پہنچے اور میں اپنا سامان لے ان کے ساتھ ایک ٹیکسی میں روانہ ہو گیا پہلے بنگلور کا عظیم الشان اسمبلی اور کونسل ہال اور سکریٹریٹ دیکھا پھر لال باغ کی سیر کی، کمرشل اسٹریٹ میں گھومے ایک مسجد میں نماز عصر ادا کر کے ایک ہوٹل میں چائے پی اور آخر مغرب کے وقت کنگ ہوٹل میں۔ ایک کمرہ لے کر میں اس میں فروکش ہو گیا۔ اس ہوٹل کے سامنے ہی ایک بڑی وسیع اور کشادہ مسجد ہے (شاید جامع مسجد یہی ہو) اس میں نو بجے جلسہ شروع ہوا۔ پہلے ڈاکٹر یوسف الدین اور ڈاکٹر محمد مرتضیٰ صدیقی نے مختصر مختصر تقریریں کیں۔ ان دونوں حضرات کو دس بجے کی ٹرین سے حیدرآباد لوٹنا تھا۔ دس بجے میری تقریر شروع ہوئی جو پونے بارہ بجے ختم ہوئی۔ بنگلور کے مسلمان اُردو خوب بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اس زبان کے تین روزنامے بھی یہاں سے شائع ہوتے ہیں۔ اس لئے تقریر اُردو میں ہوئی۔ مسجد کا اندرونی حصہ بالکل بھرا ہوا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے آواز دور دور جا رہی تھی۔ اس لئے مسجد کے صحن میں اور بازار میں دکانوں پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے سن رہے تھے۔ دو تین نوجوان جو میرے سامنے بیٹھے تھے میں نے دیکھا کہ وہ نوٹ بھی لے رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ مجمع میں عوام کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ اور علماء اور خواص کا ایک بڑا طبقہ بھی شروع سے آخر تک شریک رہا۔

یہ تقریر جس کے لئے دن بھر گھومتے پھرتے رہنے کی وجہ سے میں کچھ سوچ بھی نہیں سکا تھا بالکل توکلاً علی اللہ ہوئی اور میں نے اس میں پہلے اس پر سخت اظہار افسوس و تشویش کیا کہ بیس برس گذرنے پر بھی ہمارا ملک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس قابل نہیں ہوا ہے کہ اس کی ایک عظیم اقلیت اپنے مستقبل کے بارہ میں مطمئن اور خود اعتماد ہوسکے۔

اس کے بعد فلسفۂ تاریخ اور فلسفۂ اخلاق کی روشنی میں ان صلاحیتوں، قوتوں اور اوصاف و کمالات پر گفتگو کی جن کی وجہ سے قومیں حضیض پستی و ادبار سے اٹھ کر اوج اقبال و عروج پر پہنچ جاتی ہیں اور پھر عرض کیا کہ اسلام انسان کی ان صلاحیتوں اور قوتوں کی تہذیب و تربیت کر کے اسے کس طرح اصلح (The fittest) بناکر اس لائق بنادیتا ہے کہ وہ تنازع للبقا کے میدان میں اپنے لئے ایک باعزت اور ممتاز مقام حاصل کرسکے۔ اس بنا پر مسلمانوں کو اپنے مستقبل کی کسی سے بھیک نہیں مانگنی ہے بلکہ ان کا مستقبل خود ان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہیں اسے تابناک بنائیں یا حسرت انجام! اس سلسلہ میں اسلام کے فلسفۂ حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے میں نے محمود اور ایاز کا واقعہ سنایا اور کہا مسلمانو! ایاز کی طرح دنیا کی ہر چمکیلی چیز سے صرف نظر کر کے "محمود" کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دو۔ دنیا کے خزانے خود بخود تمہارے قدموں پر آگریں گے۔ من کان للہ کان اللہ لہٗ ومن کان اللہ لہٗ کان العالم لہٗ یہ کہتے کہتے ایک مقام پر جب میں نے ذرا زور دے کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا " دوستو! سیاں روٹھ گیا ہے آؤ اسے منالیں تو ساری گرہیں خود کھل جائیں گی تو میں نے دیکھا بہت سی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں"۔

بہر حال جلسہ ختم ہوا۔ اپنے ہوٹل میں آیا۔ چند حضرات ساتھ تھے۔ انھیں میں آندھرا پردیش کی جماعت اسلامی کے امیر مولانا سراج الحق بھی تھے جو دورہ پر آئے ہوئے تھے۔ ان سب کے ساتھ چائے نوش جان کی۔ یہ رخصت ہوئے تو ایک بجے کے قریب کمرہ میں گیا اور سو گیا۔

میسور کے لئے روانگی دوسرے دن یعنی ۹ کی صبح کو نو بجے کے قریب یوسف شریف صاحب حسب قرارداد کار لے کر آگئے۔ اصحاب ثلاثہ یعنی خالد عرفان صاحب۔ مشتاق احمد صاحب علوی اور نذیر احمد صاحب پہلے سے ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ یوسف صاحب کے ساتھ ان کی ننھی منی بچی عشرت سلمہا بھی تھی۔ ۹ بج کر دس منٹ پر ہم سب روانہ ہوگئے۔ میسور بنگلور سے اسی میل کی مسافت پر ہے۔ لیکن یہ پورا علاقہ اس درجہ حسین و دلکش ہے کہ ہر قدم پر "چشم کو ہر رنگ میں وا" ہوجانے کی دعوت دیتا ہے سبزہ جہاں جہاں اور لالہ چمن چمن۔ ہمہ خلق ہمہ کشمیر۔ یہاں اگر کمی ہے تو اس چیز کی جسے اقبال نے کہا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دختر کے برہنہ لالہ رخے سمن برے | چشم بروئے او کشا باز بجوش تن نگر

اور اس میں شک نہیں کہ یہ کچھ معمولی نہیں ہے کیوں کہ ظرف حسین ہو اور ساتھ ہی مظروف بھی جاذب تو اس کا عالم ہی دوسرا ہوتا ہے۔ ایک جام بلوریں میں سادہ پانی بھر کر رکھ دیجئے کوئی اسے آنکھ اٹھا دیکھے گا بھی نہیں اور اس میں آتش سیال انڈیل دیجئے تو جگر کے بقول رنگ اڑنے لگے گا۔

دم بخود ہیں حضرت زاہد ہیں تک دیکھ کر | ہوش اڑ جاتے اگر شیشہ سے باہر دیکھتے

لیکن میری طرح جو لوگ حسن ذاتی کے قدرداں ہوتے ہیں وہ حسن اضافی کے بغیر بھی گذارہ کر لیتے اور غالب کی طرح انھیں یہ شکوہ نہیں ہوتا کہ

بجلی اک کوند گئی آنکھ کے آگے تو کیا | بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

راستہ میں ایک مقام پڑتا ہے "رام نگر" یہاں گھر گھر ریشم سازی کے کارخانے ہیں اور ان کے مالک زیا مسلمان ہی ہیں۔ ایک سرکاری اسکول اس صنعت کی تعلیم اور ٹریننگ کے لئے بھی ہے۔ میری خواہش پر کار رکا ایک صاحب جن کا نام فصیح الدین تھا ہم ان کے کارخانہ میں گھس گئے اور وہاں دیکھا کہ ہزاروں کیڑے، کی بڑی بڑی ناندوں میں پڑے ہوئے ہیں اور جس مشین پر کپڑا بنا جاتا ہے اسی قسم کی مشین کے ذریعہ کیڑوں سے رُ حاصل کر کے اسے کاتا جا رہا ہے۔ طبیعت بہت محظوظ ہوئی اور بے ساختہ زبان سے فتبارک اللہ احسن الخالقین نکل گیا۔ یہاں سے روانہ ہو کر ایک جگہ چائے اور اسی کے ساتھ اس نواح کا ایک خاص قسم کا جو چاول کے آٹے سے بنتا ہے اور واقعی بڑا لذیذ ہوتا ہے (یہاں اسے ڈوسے کہتے ہیں) کھاتے ہوئے ۲ بجے کے لگ بھگ سرنگا پٹم پہنچ گئے۔ یہ وہی مقام ہے جس کا نام زبان پر آتے ہی دل فرط عقیدت سے جو آنکھیں ڈبڈبا اٹھیں اور کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔

خار خار کوئے یارے ہست ہر کس را دلیست | نشگفد ہر گل کہ در پائے دلش این خار نیست (نظیریؔ)

یہ وہ سرزمین عبرت آگین ہے جس کے ذرہ ذرہ میں غیرت اسلامی و حمیت قومی کے شرارے دفن ہیں لو ا اب تک ان کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں پہلے مسجد اعلیٰ دیکھی۔ ادھر ادھر قرآن کی جو آیات کندہ ہیں اور جن میں جہاد کا حکم ہے وہ اور دوسرے کتبات پڑھے۔ پھر مسجد اعلیٰ میں پہلے ظہر کی نماز ادا کی اور اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعد ایک پرشکوہ گنبد میں داخل ہوئے۔ یہاں سلطان ٹیپو شہید۔ ان کے والد اور والدہ کی قبریں ہیں۔ میں سلطان کی قبر پر سرہانے کی جانب بیٹھ گیا پیس منٹ تک آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت کھڑا اور فاتحہ پڑھتا رہا۔ کہہ نہیں سکتا قلب پر اس وقت کیا کیفیت طاری تھی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن   خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

یہ لوگ مر کر بھی کس طرح زندہ رہتے ہیں؟ وہاں خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ لیکن یہ مشاہدہ محبت کی خلش کی مانند ہے کہ محسوس تو ہوتی ہے مگر بیان نہیں کی جاسکتی۔ گنبد کے ادھر ادھر کثرت سے شہزادوں۔ شہزادیوں اور دیگر افراد خاندان کی قبریں ہیں۔ فاتحہ ان پر بھی پڑھی۔ اس کے بعد سلطان کا قصر گرما دیکھا اس کی دیواروں پر جنگوں اور درباری زندگی کی مختلف حالتوں کی تصاویر بنی ہوئی ہیں جو ظاہر ہے انگریزوں کی ایجاد ہے اس میں وہ منظر بڑا رقت انگیز ہے جس میں سلطان کے دو بچوں کو گورنر جنرل کے بطور یرغمال حوالہ کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یہ پینٹنگ میں نے کلکتہ میں بھی دیکھی ہے اور جب کبھی دیکھی ہے غصہ کے مارے خون کھولنے لگا ہے۔ قصر کے قریب ہی ایک عظیم الشان مندر ہے جو متعصب مورخین کے برخلاف سلطان کی غایت درجہ مذہبی ناطرفداری کا روشن ثبوت ہے۔

یہاں سے روانہ ہوکر ڈیڑھ بجے کے قریب شہر میسور میں داخل ہوتے۔

اللہ! اللہ! کیا عجیب و غریب شہر ہے! ایک بلدۂ حسن و موسیقی۔ ایک معمورۂ نشاط و انبساط! اسے ہندوستان کا باغوں کا شہر (Garden City) کہتے ہیں تو بجا کہتے ہیں۔ ایک ریسٹوران میں لنچ کھایا۔ ظہر کی نماز ادا کی اور اس کی سیر کے لئے روانہ ہو گئے۔ سب پہلے چڑیا گھر (Zoo) دیکھا۔ پھر آرٹ پیلیس پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ اس کے بعد ایک پہاڑی پر پہنچے جس کا نام چامنڈی ہلس (Chamundi Hills) ہے۔ اس کی بلندی کوئی ساڑھے تین ہزار فٹ ہے اور شہر سے تین میل دور۔ یہاں ایک نہایت عالی شان مندر ہے جو چامنڈی دیوی کی طرف منسوب ہے۔ یہ وہی دیوی ہیں جو شیوجی کی بیوی ہیں اور جنھیں شمالی ہند میں درگا دیوی کے نام سے پوجا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک راکشس کو قتل کیا تھا جس نے قرب و جوار میں عظیم تباہی مچا رکھی تھی۔ اس راکشس کا نام مہیشا سورا تھا۔ اسی لئے اس مقام کا اصل نام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"چھیشا سورا پورا" تھا جو بعد میں چل کر "میسور" بن گیا۔ چامنڈی دیوی شاہی محل کی بھی دیوی اس طرح اس مندر سے حکمرانوں کا خاندانی تعلق رہا ہے۔ چنانچہ دسہرہ کے تیوہار کے فوراً بعد رات کو روشنیوں سے مزین اور آراستہ چامنڈی دیوی کا رتھ نکالا جاتا ہے جس کے جلوس میں مہ خود شریک ہوتے ہیں۔ اس وقت طوفان رنگ و نور کا عجب سماں ہوتا ہے۔ ہم نے اس مندر کو طرف سے گھوم پھر کر خوب دیکھا اور اس کے اندر جو کچھ ہے اس پر بھی ایک نگاہ ڈالی۔ میں پہاڑ کا ہوں۔ ہندوستان کا کوئی ہی پہاڑ ہوگا جہاں میں نہ گیا ہوں۔ یہاں بھی وہی نشیب و فراز اور پیچ تو طبیعت بڑی محظوظ ہوئی:

کم نہیں نازش ہمنائی چشم خوباں　　تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

مندر کے پہلو میں ایک گائے کا نہایت عظیم الشان مجسمہ ہے جس میں صنعت کار نے کمال یہ دکھایا ہے مجسمہ صرف ایک چٹان کی تراش خراش سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کو بھی دیکھا۔ واقعی فن کاری کی انتہا یہاں مہاراجہ کا ایک محل بھی ہے۔ اسے دور سے ہی دیکھتے ہوئے نیچے اترے۔ شہر کے سب سے زیادہ بارو میں پہنچ کر بازار دیکھے۔ ایک ریستوران میں چائے پی۔ عصر کی نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔ اس لئے قریب بڑی مسجد تھی اُس میں عصر کی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد مغرب کی نماز جماعت سے ادا کی۔ یہ دیکھ کر خوشی کہ جماعت میں مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔

اب اس وقت مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ فضا بڑی خوش گوار تھی اور ہماری کار اُڑی چلی جا رہی تھی بارہ ۱۲ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم لوگ برنداون گارڈن (rindavan Garden پہنچے۔ یہ گارڈن کرشنا راج ساگر ڈیم سے متصل اور بالکل اُس کے پہلو میں ہے۔ یہ ڈیم (بند) پونے میل لمبا ہے اور اس کے پانی سے کوئی سوا دو لاکھ ایکڑ زمین کی آب پاشی کی جاتی ہے۔ اس بند کی بنیاد ٹیپو شہید نے ۱۲۱۲ھ میں ایک ساعت نیک و سعید میں ڈالی تھی۔ بند کے داخلہ پر ایک سنگین کتبہ ہے ا میں بزبان فارسی اس کا حوالہ تفصیل سے کندہ ہے۔

اندھیرے کے باعث اس بند کو تو اچھی طرح نہیں دیکھا جا سکا لیکن اس کے پہلو میں ہی جو گارڈن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس سے جی بھر کر لطف اندوزی کی ۔ سبحان اللہ! کیا باغ ہے ۔ قسم قسم کی روشنیوں کے باعث جو آبشار میں اور روش کے دونوں جانب اور ادھر ادھر پانی کے قطعات میں لگائی گئی تھیں ایک عجب عالم رنگ و نور تھا ۔ بیچ بیچ میں جو فوارے تھے اُن میں بھی مختلف رنگوں کی روشنی اس اہتمام و انتظام سے پیوست کی گئی تھی کہ فوارہ سے رنگین پھوارین نکلتی تھیں گویا قوس قزح محلول ہو کر برسنے لگی ہے یا جل پریوں نے قبائے طاؤسی زیب تن کر کے رقص شروع کر دیا ہے ۔ عجیب پرکیف و نشاط آفریں منظر تھا ۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حافظ کی غزلوں اور خیام کی رباعیات نے مجسم ہو کر فضا کو ہمہ نغمہ و شعر اور یک پیکر نزہت و لطافت بنا دیا ہے ۔

عزیز سیٹھ صاحب کے ہاں طعام شب طلسمات رنگ و نور کا یہ عالم یہاں روزانہ ڈیڑھ دو گھنٹہ رہتا ہے آٹھ بجے کے قریب جب اس کے اختتام کا وقت قریب آیا تو ہم لوگ یہاں سے روانہ ہو کر عزیز سیٹھ کے مکان پر آئے ۔ موصوف اس علاقہ کے دیرینہ اور بلند مرتبہ قومی کارکن ہیں اور ایم ۔ ال ۔ اے بھی ہیں ۔ یوسف شریف صاحب نے پہلے سے ان کو میرے میسور پہنچنے کی اطلاع کر دی تھی اور انھوں نے طعام شب کا اہتمام کرنے کے ساتھ میسور کے چند ذی علم حضرات کو مجھ سے ملنے اور گفتگو کرنے کے لئے مدعو کر لیا تھا ۔ چنانچہ تو سوا نو بجے کے قریب عزیز سیٹھ صاحب کے مکان پر ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ متعدد حضرات تشریف لے آئے ۔ ان میں صرف محب مکرم جناب مبارز الدین رفعت صاحب شعبۂ اُردو مہارانی کالج سے بواسطۂ برہان غائبانہ تعارف تھا ۔ اب ان سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا ۔ ان کے علاوہ جن حضرات کے نام یاد رہ گئے ہیں وہ یہ ہیں :

۱ ۔ جناب علی جان صاحب شعبۂ عربی مہارانی کالج

۲ ۔ جناب سلیم تمنائی صاحب مشہور افسانہ نگار

۳ ۔ جناب یوسف سیٹھ صاحب شعبۂ انگریزی فلومنا کالج

۴ ۔ جناب ہیڈ ماسٹر صاحب فاروقیہ ہائی سکول ۔ ان کے علاوہ جو اور حضرات تھے اور وہ غالباً طبقۂ تجار سے اور اسلامی و تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے تھے ۔ سخت افسوس ہے کہ ان کے نام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یاد نہیں رہے" معذرت خواہ ہوں" بہر حال بڑا سنجیدہ۔ مہذب اور شائستہ مجمع تھا۔ اب گفتگو شروع ہوئی ——— اور موضوع وہی مسلمانوں کے مسائل و معاملات ——— تو ساڑھے دس بج گئے۔ بولنا مجھے ہی پڑا۔ پورا دن اسی طرح ایک منٹ کے لئے کمر سیدھی کئے بغیر نقل و حرکت میں گذر گیا۔ ابھی بنگلور واپس ہونا بھی تھا اس لئے میں نے بادل نخواستہ ان حضرات سے اجازت لی اور اب کی گل ریز و عطر بیز فضاؤں اور ہواؤں کو الوداع کہتے ہوئے واپس روانہ ہو گئے۔ ڈیڑھ بجے کے بنگلور پہنچے۔ احباب کو شب بخیر کہہ کر میں ہوٹل کے اپنے کمرہ میں آیا۔ عشاء کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ اور خواب کی دنیا میں غائب ہو گیا۔

معلوم نہیں کس طرح میرے دماغ پر یہ خیال مسلط ہو گیا تھا کہ میرا جہاز مدراس کے لئے ۱۰ ستمبر کے بعد روانہ ہو گا۔ چنانچہ اسی کا تذکرہ میں نے احباب سے کیا تھا اور اسی کے مطابق انھوں نے اس تا میں دن بھر کے لئے بنگلور میں میری مصروفیات کا ایک پروگرام بنا لیا تھا اور اسی مفروضہ کی بنیاد پر سے واپسی کے بعد شب میں اپنے اصحاب اربعہ سے جدا ہوا تو اس قرار داد کے ساتھ کہ صبح نو بجے یہ حضرات پہنچ جائیں گے۔ لیکن خدا کی شان دیکھئے۔ صبح میں ضروریات و مشاغل صبح گاہی سے فارغ ہو کر صوفہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک خیال آیا کہ ذرا ٹکٹ تو دیکھ لوں۔ اب ٹکٹ جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ جہاز ۱۰ کے بعد نہیں بلکہ ابھی ۴۵ – ۷ پر جا رہا ہے اور اس وقت گھڑی میں سات بج رہے تھے۔ پھر یہ اندازہ نہیں تھا کہ اڈہ یہاں سے کتنی دور ہے بس ہاتوں کے طوطے اڑ گئے۔ پیشانی پر پسینہ آگیا۔

مدراس کے لئے روانگی | بہر حال اللہ کا نام لے کر اٹھا۔ جلدی جلدی سامان پیک کیا۔ ہوٹل کا بل ادا کر کے ملازم کو سامان دیا اور باہر آیا۔ سامنے ہی ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ڈرائیور سمجھ گیا کہ وقت کم رہ گیا ہے اور میں گھبرایا ہوا ہوں۔ اس لئے اُس نے واجبی کرایہ سے دُگنا تگنا کرایہ مانگا۔ میں نے فوراً ہاں کر لی۔ اُس نے کرایہ منہ مانگا لیا لیکن حق ادا کر دیا۔ اس قدر تیز لایا کہ جہاز کی روانگی سے پندرہ منٹ پہلے پہنچا دیا۔ جہاز تو مل گیا لیکن اُس سے جتنی خوشی ہوئی اُس سے کہیں زیادہ افسوس اور قلق اس بات کا ہوا کہ روانگی کے وقت اصحاب اربعہ یعنی یوسف شریف صاحب۔ خالد عرفان صاحب۔ مشتاق احمد اور نذیر احمد صاحبان :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملاقات نہ ہوسکی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یوسف صاحب کار نہ لاتے اور اپنے اپنے دفتروں سے رخصت لے کر یہ سب صاحبان ساتھ نہ ہوتے تو میں بنگلور۔ سرنگا پٹم۔ اور میسور کا اس درجہ کامیاب سفر اور اس قدر راحت و آرام کے ساتھ ہرگز نہیں کرسکتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ سب احباب اس درجہ مہذب۔ شائستہ۔ خوش ذوق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں کہ ان کی معیت میں ہم مذاقی کا لطف و سرور بھی حاصل رہا۔ میں ان حضرات کی مخلصانہ محبت و عنایت کا تہِ دل سے شکر گذار ہوں۔ اُس دن سنٹرل مسلم ایسوسی ایشن میں میرا استقبالیہ (Reception) تھا۔ میرے چانک روانہ ہوجانے سے ان حضرات کو مایوسی ہوئی اور سارا پروگرام درہم برہم ہوگیا۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

مدراس میں قیام | جہاز مقررہ وقت کے مطابق ٹھیک ساڑھے سات بج کر بنتالیس منٹ پر اڑا اور آٹھ بج کو پینتیس منٹ پر مدراس پہنچا دیا۔ مدراس میں احباب کی اچھی تعداد ہے لیکن میری عادت یہ ہے کہ اس قسم کے سفر کے موقع پر کسی کو خبر تک نہیں کرتا اور کسی دوست کا مہمان بننے کے بجائے ایک صاف ستھرے ہوٹل میں قیام کرنے کو پسند کرتا ہوں۔ اسی میں میں آزاد بھی رہتا ہوں اور ہر طرح کی راحت بھی ملتی ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی یہی کیا ایرپورٹ پر اتر کر مدراس کے مرکزی مقام ماؤنٹ روڈ آیا اور ایک ہوٹل جس کا نام امبیسیڈر ہے (Ambassador) اس میں اپنی پسند کا ایک کمرہ لے کر فروکش ہوگیا۔ دس بجے کے قریب بشیر احمد سعید صاحب (سابق جج مدراس ہائیکورٹ) جو میرے دیرینہ کرم فرما اور بزرگ ہیں اور علمی و فنی مہارت کے ساتھ اخلاص و جوشِ عمل کی وجہ سے جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے ان کو فون کیا۔ ان کو پہلے سے سی اطلاع کے بغیر میرے اچانک پہنچ جانے پر بڑا اچنبھا ہوا۔ بہرحال فون پر قرارداد کے مطابق شام کو پانچ بجے اُن کے مکان پر پہنچا۔ وہ اور بیگم صاحبہ دونوں کے ساتھ چائے پی۔ یہیں انھوں نے ایک زنانہ کالج میں تقریر کی فرمائش کی۔ مجھ سے انکار نہ ہوسکا۔ چائے سے فراغت کے بعد وہ مجھے اپنی کار میں لے کر روانہ ہوئے۔ پہلے افضل العلماء مولانا محمد یوسف صاحب کوکن عمری صدر شعبۂ عربی و فارسی مدراس یونیورسٹی کے مکان پر پہنچے۔ موصوف میرے دیرینہ اور عزیز دوست ہیں۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو دنگ رہ گئے اور ہیر وانی پہن فوراً ساتھ ہو گئے۔ اب ہم تینوں نے سمندر کے کنارے کنارے پورے علاقہ کا چکر لگایا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بشیر احمد سعید صاحب بتاتے جاتے تھے کہ یہ فلاں بلڈنگ ہے۔ فلاں مقام ہے۔ یہ نوابان ارکاٹ کے محلات ہیں جن میں اب یہ دفتر ہے وہ دفتر ہے مدراس یونیورسٹی کے فلاں فلاں شعبے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے کار سے اُتر کر ساحل پر بھی چہل قدمی کی۔ بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ مغرب کے بعد مجھے اور مولانا محمد یوسف صاحب کوکن کو میرے ہوٹل میں اتار کر بشیر احمد سعید صاحب گھر روانہ ہو گئے: مولانا موصوف جنوبی ہند اور خصوصاً مدراس کی اسلامی تاریخ کے بڑے فاضل اور محقق عالم ہیں۔ انگریزی۔ عربی اور اُردو تینوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور متعدد ضخیم کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ اب وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر چلے۔ ہوٹل سے تھوڑے ہی فاصلہ پر مشہور تاریخی مسجد والاجاہی تھی وہاں پہنچے۔ اس مسجد کے ساتھ ایک قبرستان بھی ہے جس میں مولانا بحر العلوم کے ساتھ اکابر علماء مشائخ اور نواب مدفون ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق بھی یہیں ہیں۔ ان مزارات پر فاتحہ پڑھی۔ پھر مسجد کے اندر داخل ہو کر اُس کی عمارت پر ایک نگاہ ڈالی اور کتبات پڑھے۔ محراب پر جو قطعہ تاریخ کندہ ہے اور جس میں "نام فرخندہ وے مسجد والاجاہی" سے اس کی تاریخ تعمیر سنہ ۱۲۱۰ھ نکلتی ہے اُس کے متعلق یہ بات دلچسپی سے سنی جائے گی کہ اس قطعہ کا مصنف ایک ہندو شاعر ہے جس کا نام منحن لال تھا بہادر خطاب اور خرد تخلص رکھتا تھا۔ یہاں مسجد میں ہی کوکن صاحب نے فرمایا "مدراس میں آپ کے قدردان اور مداح بڑی تعداد میں ہیں۔ آپ کے چلے جانے کے بعد ان کو اطلاع ہوئی تو انھیں مجھ سے سخت شکایت ہوگی کہ میں نے خبر کیوں نہ کی" میں نے عرض کیا "نفس ملاقات تو باعث مسرت ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جو ملتا ہے تقریر کی فرمائش کرتا ہے اور میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ اس لئے آپ کسی کو اطلاع نہ کریں۔" کوکن صاحب بڑے جزبز ہوئے لیکن آخر کار میری مجبوری کے پیش نظر انھوں نے وعدہ کیا اور اس کو اس طرح نباہا کہ راہ چلتے اگر کوئی صاحب ملے اور انھوں نے میرے متعلق دریافت فرمایا بھی تو وہ گول مول بات کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

کتب خانہ دیوان صاحب کا باغ دوسرے دن یعنی ۱۱ ستمبر کو صبح نو بجے حسب قرارداد مولانا محمد یوسف کوکن ہوٹل پہنچ گئے اور ہم دونوں کتب خانہ دیوان صاحب کا باغ پہنچے۔ دراصل جنوبی ہند میں مولوی محمد غوث شرف الملک بہادر المتوفی سنہ ۱۲۳۸ھ کا خاندان علم و فضل۔ شرافت اور دینداری میں بہت ممتاز اور مشہور چلا آرہا ہے ان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مورثِ اعلیٰ نویں صدی ہجری کے ایک بزرگ فقیہ علا احمد شافعی تھے۔ اس خاندان کی خصوصیت یہ ہے کہ شروع سے اب تک مسلسل دین اور علم کی خدمت انجام دیتا چلا آرہا ہے اور اس میں اکابر علماء مصنفین و مشائخ پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس) ڈاکٹر یوسف الدین (حیدرآباد) اور ڈاکٹر محمد غوث (مدراس) اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ حیدرآباد کا مشہور کتب خانہ "سعیدیہ" اسی خاندان کے افراد کا اندوختہ ہے اور اسی طرح مدراس کا یہ کتب خانہ جو در حقیقت مختلف افراد خاندان کے الگ الگ چند ذاتی کتب خانوں کا مجموعہ ہے اس خاندان کا لائق صد ہزار نازش و فخر سرمایۂ حیات ہے۔ یہ کتب خانہ کیا ہے؟ عجیب و غریب نوادر مخطوطات در نایاب مطبوعہ کتب۔ شاہی فرامین و دستاویزات۔ بیجاپور کے عادل شاہی اور مدراس کے والاجاہی عہد کے خاندانی اور دفتری خطوط و مراسلات رکارڈس۔ بیاضوں۔ روزنامچوں۔ اور ان کے علاوہ خطاطی کے بہترین نمونوں۔ الواح۔ سکے۔ برتن۔ مہریں اور کپڑے وغیرہ ان سب چیزوں سے بھرا ہوا ہے۔ حالیہ شمار کے مطابق اس وقت ان کتب خانوں میں ۲۹۴۷۱ (انتیس ہزار چار سو اکہتر) کتابیں ہیں جن میں سے دس ہزار سات سو پچاس قلمی ہیں بعض مخطوطات اور بعض تحریریں ایسی ہیں جو بے شبہ دنیا میں کسی اور جگہ نہیں ملیں گی۔ لیکن سخت افسوس اور بڑے شرم کی بات ہے کہ علم و فن کا یہ گنجینۂ نایاب ناقدری کے ہاتھوں پامال خزاں ہو رہا ہے۔ یہ سب نوادر جو اہر بے ترتیب بستوں۔ ٹرنکوں صندوقوں اور الماریوں میں تشتم بشتم بھرے ہوئے ہیں۔ غربت کی وجہ سے ان کتب خانوں کے مالک ان کی خاطر خواہ دیکھ بھال و نگرانی کر نہیں سکتے اور نہ مسلمانوں کو اس طرف توجہ ہے اور نہ حکومت کو۔ اکیلے دم کے ڈاکٹر محمد غوث ہیں جو شب و روز ان کی تنظیم و ترتیب میں لگے ہوئے ہیں لیکن کثیر سرمایہ کے بغیر کیا ہو سکتا ہے؟ ضرورت ہے کہ سرسالار جنگ میوزیم کی طرح اس کی حفاظت اور تنظیم و ترتیب کا سرو سامان ہو۔

وقت کی تنگی کے باوجود میں نے اس کتب خانہ میں مسلسل چار گھنٹے صرف کئے۔ ڈاکٹر محمد غوث صاحب بڑی محبت اور توجہ کے ساتھ خاص خاص چیزیں نکال نکال کر دکھاتے جاتے تھے اور میں اپنے ذوق کی خاص اور نایاب چیزوں کی یادداشت اپنی بیاض میں لکھتا جاتا تھا۔ مولانا محمد یوسف کوکن اس مہم میں برابر میرے شریک اور معاون رہے۔ ناظرین کی ضیافت کے لئے بعض نوادر کا ذکر کرتا ہوں:۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱) کتاب المصباح المضئ فی کتاب النبی الامی و رسله الی ملوک الارض من عربی و عجمی :

اس کے مصنف آٹھویں صدی ہجری کے محمد بن علی بن احمد بن حدیدۃ الانصاری ہیں۔ ۷۸۳ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم کاتبوں اور اہم قاصدوں کا تذکرہ ہے اور اس کے بعد مراسلات۔ دنیا میں اب تک اس کتاب کے صرف تین نسخوں کا پتہ چلا ہے جن میں سے ایک یہ ہے۔ ایک پیرس کی امپیریل لائبریری اور ایک پٹنہ میں۔ عجیب و غریب مخطوطہ ہے دیکھتے ہی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

(۲) جداول النورانیہ فی استخراج الآیات القرآنیہ :۔ اس کتاب کو اورنگ زیب عالمگیرؒ کے لئے ناصر بن المحسنی و المحسینی النجفی نے ترتیب دیا تھا۔ سرنگاپٹم کے سقوط کے بعد جب سلطان ٹیپو شہید کے محل میں لوٹ مچی ہے تو یہ نسخہ سلطان کے پلنگ پر تکیہ کے پاس رکھا ہوا ملا تھا۔

(۳) القواعد لبدر الدین الزرکشی :۔ یہ فقہ شافعی میں قانون کی ڈکشنری ہے

(۴) روزنامچہ مولوی عبدالوہاب امیر الامراء بہادر المتوفی ۱۲۸۵ھ اس میں چار تاریخیں ہیں (۱) ہجری (۲) ا

(۳) عیسوی (۴) تامل

(۵) مولوی محمد غوث صاحب نے ایک ضخیم کتاب "نثر المرجان فی رسم نظم القرآن" کے نام سے لکھی تھی کتاب عرصہ ہوا چھپی تھی یہاں اس کتاب کا اصل مسودہ مصنف کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ اس پر ایک نگاہ ڈالنے سے پتہ چلا کہ مصنف نے اولاً اس کا نام "نثر الریحان" تجویز کیا تھا۔ بعد میں رائے بدل گئی تھی۔

وقت کی تنگی کے باعث دل پر انتہائی جبر کر کے ایک بجے کے قریب کوکن صاحب اور میں یہاں سے روانہ ہو کر سیدھے یونیورسٹی پہنچے۔ یہاں کی لائبریری میں علوم مشرقیہ کے مخطوطات کا ایک الگ مگر نہایت وسیع سکشن ہے۔ لائبریرین کی اجازت لے کر اس میں گھس گئے۔ فارسی میں فیضی کے ترجمہ مہابھارت کا نہایت خوبصورت اور مخطوطہ اور طب میں کفایۃ الاطباء کا ضخیم مخطوطہ دیکھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں سنسکرت۔ تامل تیلگو اور پالی کے اسّی ہزار مخطوطات موجود تھے جو تپوں یا درخت کی چھالوں پر لکھے ہوئے مکمل طور پر محفوظ تھے اور ایک کمرہ میں دو تین پنڈت اڈیٹنگ ورک کر رہے تھے۔ یہاں سے رخصت ہو کر میں ہوٹل آیا اور کھانا کھا کر ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر قیلولہ کیا۔

زنانہ ۲ بجے میری انگریزی تقریر | پروگرام کے مطابق ابھی چار بجے تھے کہ کوکن صاحب تشریف لے آئے اور ہم دونوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایس۔آئی۔ای۔ٹی ویمن کالج پہنچے۔ اس کالج کی عمر ابھی صرف بارہ برس ہے لیکن اس کا شمار مدراس کے اعلیٰ درجہ کے کالجوں میں ہوتا ہے۔ بشیر احمد سعید صاحب اس کے بانی اور ان کی بیگم صاحبہ اس کے چیئرمین ہیں، لڑکیوں کی تعداد دو ہزار تین سو اور استانیاں ایک سو دس ہیں جن میں تین سو لڑکیاں اور ۳۶ استانیاں مسلمان ہیں۔ کالج پر ایک سو ساٹھ لاکھ خرچ ہو چکا ہے۔ اور اس رقم میں ۷۰ فی صد مسلمانوں کا حصہ ہے جن میں عرب ممالک کے فرماں روا اور ملیشیا و سنگاپور کے فرزندانِ اسلام بھی شامل ہیں۔ بلڈنگ کے ایک خاص حصہ میں (اسمبلی ہال کے قریب) سنگِ مرمر کی تختیوں پر ان معطی حضرات کے نام کندہ ہیں۔ آرٹس اور سائنس کے تمام مضامین کی تعلیم ہوتی ہے۔ ساڑھے چار بجے ایک وسیع اور کشادہ ہال میں جلسہ شروع ہوا۔ مرد تو لے دے کے صرف چار تھے۔ پورا ہال معلمات و متعلمات سے بھرا ہوا تھا گویا "طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ"۔ پہلے ایک طالبہ نے قرأت کی۔ پھر بانی کالج نے میرے متعلق ایک تعارفی تقریر کی۔ اب میں کھڑا ہوا۔ تقریر شروع کی۔ یہاں مسلمان لڑکیاں تو اُردو سمجھتی اور کچھ بول بھی لیتی ہیں۔ لیکن بیرونی ملکوں کی اور مقامی غیر مسلم لڑکیاں نہیں سمجھتیں اور بشیر سعید صاحب نے پہلے سے کہہ بھی دیا تھا۔ اس لئے تقریر انگریزی زبان میں کی جو تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ شروع میں میں نے کہا "میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام کیا ہے؟ کیوں کہ بدقسمتی سے اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جس کو مغرب اور مشرق نے غلط سمجھا ہے۔ غیر مسلموں نے اور حد یہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں نے اسے غلط سمجھا ہے۔ اس کے بعد ایمان و عمل کے سیاق میں حکمت نظری اور حکمت عملی پر روشنی ڈال کر ثابت کیا کہ حضور کس طرح رحمت عالم اور اسلام ایک دینِ فطرت ہے، بشیر سعید صاحب کم کسی کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن جب میں تقریر کر کے بیٹھا تو انھوں نے بڑے متاثرانہ انداز میں مصافحہ کیا اور فرمایا Moving and fine speech (حرکت انگیز اور عمدہ تقریر) جلسہ برخاست ہوا تو اب بشیر سعید صاحب مجھے دروازہ کے قریب لے کر کھڑے ہو گئے۔ ایک ایک معلمہ نکلتی جاتی تھی اور وہ ان کو مجھ سے متعارف کراتے جاتے تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دیکھنے میں یہ نوعمر لڑکیاں سی تھیں لیکن سب کی سب کوئی ایم۔اے کوئی ایم۔ایس۔سی اور سائنس اور آرٹ میں پی۔ایچ ڈی سے بھی کم نہیں۔ اس کے بعد ایک ہال میں اسٹاف کے ساتھ عصرانہ کا انتظام تھا جو بہت پُر تکلف اور باسلیقہ تھا۔ اس سے بھی فراغت ہو گئی تو بشیر سعید صاحب نے کالج کی عمارتیں۔ کلاس رومز۔ لیبوریٹریز۔ ہاسٹل۔ آڈیٹوریم۔ سوئمنگ پول۔ کھیل کے میدان۔ لائبریری۔ ریڈنگ روم۔ کامن روم۔ کچن۔ ڈائننگ ہال۔ ریستوران۔ اکزامنیشن ہال۔ دفاتر۔ سِک روم (بیمار گھر) یہ سب چیزیں اطمینان اور تفصیل سے دکھائیں۔ ہر بلڈنگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ہر عمارت نک سک سے درست ٹپ ٹاپ۔ ماڈرن طریقے کی اور بہترین فرنیچر سے آراستہ لڑکیوں اور اُستانیوں سب کا لباس بہت سادہ نہ کنگھی چوٹی نہ کسے کساتے نیم عریاں بلاؤز اور نہ مانگ نہ سیندور۔

کالج میں ایک نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب مسجد بھی ہے جو سوا لاکھ روپیہ کے صرف سے تیار ہوئی ہے اس کا ساز و سامان بھی اعلیٰ قسم کا ہے وضو کے لئے بہت سے نل لگے ہوئے ہیں جن میں پانی قریب ہی ایک بہت بڑا کنواں ہے اُس سے مشین کے ذریعہ پہنچتا ہے۔ میں نے عصر اور مغرب دونوں وقت کی نماز اسی مسجد میں ادا کی۔ جب عصر کی نماز پڑھی تھی تو دیکھا تھا کہ مسجد میں کچھ لڑکیاں نماز پڑھ رہی تھیں اور کچھ تلاوت قرآن میں مصروف تھیں۔ مغرب کے وقت ایسا ہوا کہ میں نے امامت کی اور اس وقت میرے پیچھے بشیر سعید صاحب۔ کوکن صاحب اور عبد السبحان عظمی صاحب جو کالج میں دینیات کے استاد ہیں۔ یہ تین حضرات تھے۔ لیکن سلام پھیرا تو دیکھا دو صفیں خواتین کی بھی تھیں چلتے اور گھومتے پھرتے دو گھنٹے ہو گئے تھے اور میں تھک سا گیا تھا اس لئے میں نے کہا "بس" بشیر سعید صاحب نے فرمایا "یہ تو ابھی کالج کی صرف ایک منزل دیکھی ہے۔ بالائی منزل پر تو گئے بھی نہیں" میں نے کہا "باقی آئندہ" اب ہم کار میں روانہ ہوئے۔ مجھے اس وقت کوکن صاحب کے ساتھ ان کے مکان پر عشائیہ کھانا تھا۔ اس لئے بشیر سعید صاحب ہم دونوں کو "زندان یوسف" پر اُتار کر گھر چلے گئے۔ یہاں کوکن فیملی سے ملاقات کر کے ایسی ہی خوشی ہوئی جیسی کہ ایک ہفتہ کے بعد اپنے گھر کا سا کھانا اور بھنی ہوئی جھینگا مچھلی شامی کباب اور فیرنی کھا کر،

دوسرے دن یعنی ۱۲ ستمبر جو مدراس میں میرے قیام کا آخری دن تھا اس کا پروگرام اس طرح شروع ہوا کہ بشیر سعید صاحب صبح نو بجے میرے ہوٹل پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ انجمن حمایت اسلام کا یتیم خانہ جس کے موصوف صدر ہیں اسے دیکھا۔ اس میں دو سو لڑکے اور لڑکیاں رہتے ہیں۔ قیام و طعام۔ تعلیم۔ مذہبی تربیت اور صنعتی ٹریننگ ان سب کا خاطر خواہ بندوبست ہے۔ لیکن عمارت بوسیدہ ہے۔ تعمیر کا کام برسوں سے رکا پڑا تھا۔ اب پھر شروع ہوا ہے۔ انجمن کی ملکیت میں نہایت وسیع قطعات زمین ہیں فنڈ نہ ہونے کے باعث یوں ہی پڑے ہوتے ہیں۔

اسے دیکھ کر یہاں سے فارغ ہو کر "دی نیو کالج" پہنچے۔ یہ کالج جنوبی ہند کے مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کا قائم کردہ ہے ۱۹۵۱ء میں شروع ہوا، اور ۱۹۶۵ء سے مدراس کا فرسٹ گریڈ کالج بن گیا۔ آرٹس اور سائنس کے تمام مضامین کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس میں بھی ایک خوبصورت اور شاندار مسجد بنی ہوئی ہے۔ مسلمان طلباء کی تعداد ۸۰ فی صدی ہے۔ گذشتہ سال تک اس کے پرنسپل ہمارے فاضل دوست مولانا سید عبدالوہاب بخاری تھے۔ موجودہ پرنسپل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گوپال کرشن صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھیں سخت افسوس ہوا کہ پہلے سے خبر نہ ہوئی ورنہ میری تقریر کراتے۔ پورا کالج۔ کلاس روم۔ لیبوریٹریز۔ ہوسٹل۔ لائبریری سب گھوم پھر کر خوب دیکھیں۔ پرنسپل کے دفتر میں مسلمان لیڈروں اور ہندو رہنماؤں کے ساتھ مسٹر محمد علی جناح کا شاندار فوٹو دیکھ کر نگاہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ انتظام سب مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ جدید مینیجنگ کمیٹی میں نو ممبر ہیں اس میں پرنسپل جو عہدہ کے اعتبار سے ممبر ہیں ان کے علاوہ سب مسلمان ہی ہیں۔ بشیر سعید صاحب بھی ایک ممبر ہیں اب میں تھک گیا تھا۔ ایک بجے کے قریب بشیر سعید صاحب نے مجھے میرے ہوٹل پہنچا دیا اور چونکہ مجھے دوسرے دن صبح ہی واپس ہونا تھا اس لئے میں نے ان سے رخصت لی اور اُن کی عنایتوں کا شکریہ ادا کیا موصوف کے عزم و ہمت اور ان کے کارناموں کو دیکھ کر دل پر بڑا اثر ہوا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم جنوبی ہند کے سرسید کہلاتے تھے بشیر سعید صاحب انھیں کے اسکول کے آدمی اور ان کے رفیق رہے ہیں۔ اس لئے اگر مولوی صاحب مرحوم واقعی اس نواح کے سرسید تھے تو بشیر سعید صاحب جنوبی ہند کے یقیناً "محسن الملک" ہیں۔

مدرسۂ جمالیہ میں میری عربی تقریر اور مذاکرہ ہوٹل پہنچ کر میں نے کھانا کھایا۔ نماز پڑھی۔ قیلولہ کیا۔ یہاں تک کہ شام کے پانچ بجے کے قریب وعدہ کے مطابق کوکن صاحب تشریف لے آئے ہم دونوں بازار کی سیر کرتے کراتے مغرب کے بعد مدراس سے چھ سات میل کے فاصلہ پر ایک مقام ہے پیرمبور ٹیکسی کے ذریعہ وہاں پہنچے۔ یہاں جنوبی ہند کا مشہور مدرسۂ جمالیہ ہے۔ اور اس کے سامنے ہی سیٹھ جمال محی الدین رہتے ہیں۔ سیٹھ صاحب دیرینہ قومی کارکن اور ممبر پارلیمنٹ ہیں سنٹرل وقف کونسل نئی دہلی کی اسلامی تعلیمی کمیٹی جس کا میں چیرمین ہوں اُس کے ممبر بھی ہیں چند ماہ سے قلب کے عارضہ میں مبتلا ہیں۔ پہلے ہم دونوں سیٹھ صاحب کے یہاں گئے۔ ان کی عیادت کی وہ دیر تک علالت کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی کی باتیں سناتے رہے۔ یہاں سے اُٹھے تو مدرسۂ جمالیہ پہنچے۔ خیال تھا کہ پانچ دس منٹ میں مدرسہ دیکھ کر واپس ہو جائیں گے لیکن وہاں مدرسہ کے دو فاضل اساتذہ محمد غزالی الجمالی اور محمد عبدالفتاح الباقوی سے ملاقات ہو گئی بس پھر کیا تھا ان حضرات نے طلباء کو جو سب وہیں رہتے ہیں خبر کر دی پانچ دس منٹ کے اندر اندر سب طلباء کمرہ میں جمع ہو گئے اور ایک جلسہ مرتب ہو گیا۔

© rasailojaraid.com

مدرسہ جمالیہ اپنی نوعیت کا واحد مدرسہ ہے۔ اس کی حیثیت درجہ تکمیل کی ہے۔ دو برس کا کورس ہے۔ فنون کی اعلیٰ کتابوں کا درس ہوتا ہے۔ بیس طلباء اور تین اساتذہ اس کی کل کائنات ہے۔ بلڈنگ شاندار ہے۔ مسجد، مدرسہ اور ہوسٹل سب ایک ساتھ ہے۔ غالب اکثریت ملیشیا، سنگاپور اور دوسرے ممالک کے طلباء کی ہوتی ہے۔ یہاں کی زبان عربی ہے۔ درس و تدریس، بات چیت، تحریر و تقریر سب کچھ عربی میں ہوتا ہے۔ مدراس یونیورسٹی سے اس کا الحاق ہے۔ اب باتوں باتوں میں نشست نے جلسہ کی شکل اختیار کر لی تو پہلے دو ملیشیائی طالب علموں نے نہایت مؤثر انداز میں تلاوت قرآن کی۔ پھر کوکن صاحب نے میرے تعارف میں عربی میں تقریر کی۔ اور اس کے بعد طلباء کے اصرار پر میں نے عربی میں اساتذۂ کرام و طلباء کو خطاب کیا۔ جس میں عربی زبان و ادب کی اہمیت اور اس کے جدید تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ تقریر کے آخر میں میں نے طلباء سے کہا کہ یہ بہتر ہوگا کہ آپ لوگ مجھ سے کچھ علمی سوالات کریں اور میں جواب دوں۔ طلباء یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے مختلف موضوعات فقہ، ادب، معاشرت سے متعلق سوالات کئے اور میں جواب دیتا رہا۔ اس طرح کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ مذاکرہ کا یہ سلسلہ قائم رہا اور طبیعت بہت محظوظ ہوئی۔ دیر کافی ہو گئی تھی اس لئے اب ہم واپس ہوئے لیکن مولانا محمد عبدالباری اور مولانا عبدالوہاب بخاری جو میرے پرانے کرم فرما اور دوست ہیں ان سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا۔ بخاری صاحب تو مدراس میں ہی نہیں تھے اور مولانا محمد عبدالباری کو میری خبر ہوئی اگلے دن یعنی ۱۲ ؍ ار کی صبح کو میرے منع کرنے کے باوجود محب صمیم مولانا محمد یوسف صاحب کوکن آٹھ بجے ہی ہوٹل پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ میں ایئر انڈیا کے دفتر آیا۔ دفتر سے کوچ ہوائی اڈہ کے لئے روانہ ہونے لگی تو کوکن صاحب کی غیر معمولی عنایتوں اور کرم گستریوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے رخصت ہوا۔ ۹½ بجے جہاز نے پرواز کی اور ٹھیک بارہ بجے یعنی ڈھائی گھنٹہ میں دلی میں پالم پر پہنچا دیا اور یہ سفر دہ روزہ ختم ہوا۔

عجیب بات ہے کہ جنوبی ہند کی فضا یہاں سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں فرقہ وارانہ تعصب اور کشیدگی کے باعث ہر وقت دماغ پر جو بوجھ رہتا ہے اس کا ان دنوں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا اور کوئی محسوس ہوتا تھا۔ مسلمان ماشاء اللہ خوش حال ہیں، تعلیم یافتہ اور اپنے مسائل سے خوب باخبر ہیں۔ اسلامی جماعت کی تبلیغی جماعت دونوں سلیقہ سے کام کر رہی ہیں۔ مسلمانوں میں تعمیری کام کرنے کے انجام دینے کی بڑی صلاحیت ہے۔ بڑی جرأت و ہمت اور جوش سے کام

ہم سکے ساتھ تشدد حالات میں ... جگہ بنانے کی کوششوں میں سرگرم ہو گئے ہیں۔ لادینی کے علاوہ ان دوستوں کی وجہ سے جنوب کے شمال کے ساتھ سخت بغض اور دشمنی ہے۔ مدراس میں حکمران پارٹی نہایت مقبول اور بہبود و فلاح ... کشمکش اور کشیدگی کا عالم بھی رہا تو اس ملک کی سالمیت اور وحدت کا خدا ہی حافظ ہے۔